ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3906

Program: BS Islamic Studies (Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: سیرت النبی ﷺ کا موضوعاتی مطالعہ (سیاسی اور بین الاقوامی پہلو) (3906) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ: 5-9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: سریہ کی تعریف، سریہ حمزہ بن عبد المطلب اور سریہ عبد اللہ بن رواحہ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سریہ کی تعریف کریں نیز سریہ حمزہ بن عبد المطلب اور سریہ عبد اللہ بن رواحہ کے واقعات بیان کریں۔ (20)

تعارف

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عسکری ابواب میں دو اصطلاحیں بار بار آتی ہیں، غزوہ اور سریہ۔ ان اصطلاحات کو درست سمجھے بغیر سیرت کی جنگی تاریخ کا مطالعہ ادھورا رہتا ہے، کیونکہ مدینہ کی ریاست کی دفاعی پالیسی کا بڑا حصہ انہی چھوٹی مہمات یعنی سرایا پر مشتمل تھا جن کی تعداد بڑے غزوات سے کہیں زیادہ تھی۔ اسلام کی اشاعت کے ابتدائی برسوں میں یہ سرایا قریش کے تجارتی راستوں کی نگرانی، اطلاعات کی فراہمی، سرحدی قبائل سے تعلقات اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اس جواب میں پہلے سریہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور غزوہ سے اس کا فرق بیان کیا جائے گا، پھر سب سے پہلے بڑے سریے یعنی سریہ حمزہ بن عبد المطلب کے واقعات اور آخر میں سریہ عبداللہ بن رواحہ کے واقعات تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔ یہ تمام بیان تاریخی و تعلیمی سیرت کی معروف کتابوں میں منقول روایات کے مفہوم پر مبنی ہے۔

سریہ کی تعریف اور غزوہ سے فرق

سریہ عربی لفظ ہے جو رات کو چلنے کے مفہوم سے جڑا ہوا بتایا جاتا ہے، کیونکہ ابتدائی مہمات خفیہ رکھنے کے لیے اکثر رات یا اچانک روانہ کی جاتی تھیں۔ اصطلاحاً سریہ اس عسکری دستے کو کہا جاتا ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کی قیادت میں کسی مخصوص مقصد کے لیے روانہ فرمایا ہو اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ ہوئے ہوں۔ اس کے برعکس غزوہ اس مہم کو کہتے ہیں جس میں آپ خود تشریف لے گئے ہوں، خواہ وہاں جنگ ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غزوہ تبوک کو جنگ نہ ہونے کے باوجود غزوہ کہا جاتا ہے۔ سرایا کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں نے مختلف اعداد بیان کیے ہیں، مگر اتفاق ہے کہ ان کی تعداد درجنوں میں تھی اور ان کے قائدین میں بڑے صحابہ شامل تھے۔ ان مہمات کے مقاصد صرف جنگ نہیں تھے بلکہ اطلاعات حاصل کرنا، قریش کے قافلوں کو دباؤ میں رکھنا، معاہدے کرنا، سرحدی علاقوں کا جائزہ لینا اور بعض صورتوں میں دشمن کی تیاریوں کو ناکام بنانا بھی شامل تھا۔ سرایا میں شریک افراد کی تعداد چند افراد سے لے کر کئی سو تک ہو سکتی تھی۔ بعض چھوٹی مہمات کو بعض علماء نے بعث بھی کہا ہے مگر عام تقسیم سریہ اور غزوہ کی ہی مشہور ہے۔ اس اصطلاحی فرق کو یاد رکھنا طالب علم کے لیے ضروری ہے کیونکہ امتحانی سوالات میں یہی بنیادی نکتہ اکثر پوچھا جاتا ہے۔

جدول: سریہ اور غزوہ کا فرق

پہلو	سریہ	غزوہ
قیادت	کسی صحابی کی امارت میں	نبی کریم ﷺ خود شریک و قائد
حجم	عموماً چھوٹا دستہ	عموماً بڑا لشکر
مقاصد	اطلاعات، نگرانی، قافلے، مہاجرے، محدود کارروائی	بڑے عسکری و سیاسی اہداف
تعداد	درجنوں مہمات	تقریباً ستائیس کے قریب مشہور غزوات

سریہ حمزہ بن عبد المطلب: وقت، قیادت اور روانگی

سریہ حمزہ بن عبد المطلب کو سیرت میں پہلا باقاعدہ سریہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی روانگی رمضان المبارک سن ایک ہجری میں ہوئی، یعنی ہجرت کے تقریباً سات ماہ بعد۔ اس دستے میں تیس مہاجر صحابہ شامل تھے اور اس کے امیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ تھے، جو اپنی شجاعت کی وجہ سے اسد اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ اسی سریے کے لیے پہلی مرتبہ اسلامی پرچم یعنی لواء تیار کیا گیا جو سفید رنگ کا تھا اور اسے حضرت ابو مرثد رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔ پرچم کی تیاری محض رسمی بات نہیں تھی بلکہ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مدینہ کی ریاست اب ایک منظم عسکری شناخت رکھتی ہے۔ اس دستے کی منزل بحیرہ احمر کے ساحل کی طرف سیف البحر کا علاقہ تھی جو العیص کے قریب واقع تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے تھے۔ مقصد قریش کے اس قافلے کو روکنا اور انہیں یہ احساس دلانا تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ سے نکالنے اور ان کے مال ضبط کرنے کے بعد ان کے تجارتی راستے بھی محفوظ نہیں رہے۔ اس وقت قریش کی معیشت کا دارو مدار انہی شامی قافلوں پر تھا، اس لیے یہ دباؤ معاشی و نفسیاتی دونوں اعتبار سے اہم تھا۔

سیف البحر میں آمنا سامنا اور بغیر جنگ واپسی

جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا دستہ سیف البحر پہنچا تو وہاں ابو جہل کی قیادت میں قریش کا بڑا قافلہ موجود تھا جس کے ساتھ تقریباً تین سو افراد تھے۔ دونوں فریق صف آرا ہو گئے اور جنگ کا ماحول بن گیا، مگر عین اس موقع پر جہینہ قبیلہ کے سردار مجدی بن عمرو الجہنی نے درمیان میں پڑ کر صلح کی کوشش کی۔ اس شخص کے تعلقات دونوں فریقوں سے تھے اور اس کی بات دونوں نے مان لی، چنانچہ بغیر کسی خون ریزی کے دونوں دستے واپس چلے گئے۔ سیرت نگار اس واقعے کو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کیونکہ یہ مدینہ کی ریاست کی پہلی عسکری پیش قدمی تھی اور اس کا انجام جنگ کے بجائے مصالحت پر ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرایا کا مقصد ہر حال میں خون بہانا نہیں تھا بلکہ سیاسی پیغام دینا اور مفاد حاصل کرنا تھا، اور جہاں مصالحت سے مقصد حاصل ہو جائے وہاں جنگ کو ٹالنا ہی اصل حکمت تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں واپسی کے بعد مدینہ میں یہ تاثر مضبوط ہوا کہ مسلمان مہاجرین اب بے سہارا نہیں رہے، ان کی ایک فعال ریاست موجود ہے جو اپنے شہریوں کے دفاع کے لیے سرحدوں تک جا سکتی ہے۔ اس نفسیاتی اثر کی اہمیت اس وقت کے حالات میں کسی فتح سے کم نہیں تھی۔

سریہ حمزہ کے مقاصد اور نتائج

اس سریے کے مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو چار باتیں نمایاں ہیں۔ پہلا مقصد قریش کو معاشی دباؤ کا احساس دلانا تھا کہ مہاجرین کے مال پر قبضہ اور مدینہ کی ناکہ بندی کی کوشش مہنگی پڑ سکتی ہے۔ دوسرا مقصد ساحلی راستوں اور قبائل کی صورتِ حال کا جائزہ لینا تھا تاکہ آئندہ پالیسی درست اطلاعات پر بنے۔ تیسرا مقصد نوزائیدہ ریاست کی عسکری تنظیم کا عملی آغاز کرنا تھا، جس میں امیر کی اطاعت، پرچم کی شناخت اور دستے کا نظم شامل تھا۔ چوتھا مقصد ساحلی قبائل، خصوصاً جہینہ جیسے قبائل سے تعلقات کا دروازہ کھولنا تھا جن کا ثالث بننا بعد میں بھی کام آیا۔ نتائج یہ نکلے کہ بغیر جنگ کے مقصد حاصل ہوا، مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہوا، قریش کو پہلی بار اپنے قافلوں کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی اور آئندہ برسوں میں بدر جیسی بڑی مہمات کی زمین ہموار ہوئی۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس سریے میں شامل افراد مہاجرین تھے، کیونکہ قریش سے براہِ راست تنازعہ انہی کا تھا اور انہیں ان راستوں کی واقفیت بھی زیادہ تھی۔ اس تفصیل سے طالب علم کو اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت کی ہر مہم سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ تھی، کوئی بھی قدم بے مقصد نہیں اٹھایا گیا۔

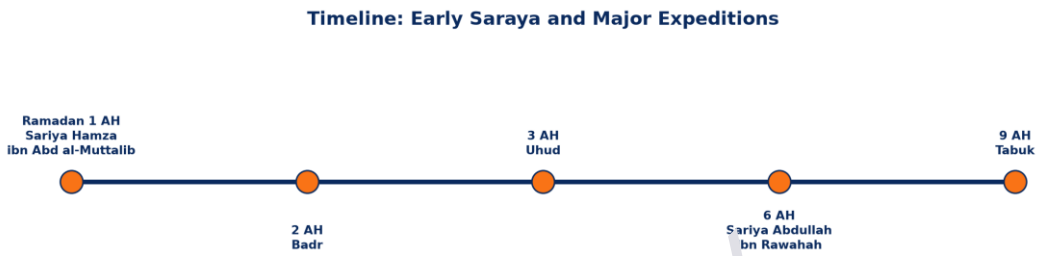

شکل ۱: ابتدائی سرایا اور بڑے غزوات کی زمانی ترتیب

سریہ عبداللہ بن رواحہ: پس منظر اور روانگی

سریہ عبداللہ بن رواحہ سن چھ ہجری میں خیبر کی طرف بھیجا گیا۔ اس کے امیر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ تھے جو نامور شاعر صحابی اور بعد میں غزوہ موتہ کے تین مقررہ امیروں میں سے ایک ہوئے۔ اس مہم کا پس منظر یہ تھا کہ خیبر کے یہودی سرداروں میں سے یسیر بن رزام نامی شخص مسلمانوں کے خلاف قبائل کو جمع کر رہا تھا اور غطفان وغیرہ کو مدینہ کے خلاف اکسانے کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ خیبر مدینہ کے لیے پہلے ہی سے حساس علاقہ تھا کیونکہ بنو نضیر کے نکالے گئے سردار بھی وہیں جا کر آباد ہوئے تھے اور قریش و غطفان سے رابطے رکھتے تھے۔ ایسے حالات میں دفاعی ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ اس تیاری کی تصدیق بھی کی جائے اور اس کا سدباب بھی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس افراد کا دستہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیجا۔ بعض روایات کے مطابق پہلے اطلاعات کے لیے بھی عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا گیا تھا اور پھر باقاعدہ دستہ روانہ ہوا۔ اس سے بھی سرایا کا اطلاعاتی کردار واضح ہوتا ہے کہ کوئی کارروائی اندازے پر نہیں بلکہ خبر کی تصدیق کے بعد کی جاتی تھی۔

خیبر میں واقعات اور انجام

سیرت کی روایات کے مفہوم کے مطابق حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے دستے نے یسیر بن رزام سے ملاقات کی اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے اور بات چیت کی دعوت دی، بلکہ خیبر کے ایک حصے کی ذمہ داری کی پیشکش بھی گفتگو میں شامل تھی۔ یسیر اس پیشکش پر اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ راستے میں صورتِ حال کشیدہ ہوئی اور روایات کے مطابق یسیر اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے اچانک حملے کی کوشش ہوئی جس کے جواب میں جھڑپ ہوئی

اور یسیر بن رزام اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔ مسلمان دستہ اس کارروائی کے بعد بحفاظت مدینہ واپس آ گیا۔ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے منصفانہ طریقہ یہی ہے کہ اسے اس دور کے سرحدی حالات اور اطلاعات کی جنگ کے تناظر میں دیکھا جائے، جہاں خیبر سے مدینہ کے خلاف اتحاد بن رہا تھا اور ریاست کے لیے خاموش رہنا اپنے شہریوں کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ بعد میں سن سات ہجری میں غزوہ خیبر کے ذریعے اس محاذ کو باقاعدہ طور پر حل کیا گیا۔ طالب علم کے لیے یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ سیرت کے ان واقعات کو پڑھتے ہوئے اسی دور کے عالمی اصولوں کو سامنے رکھا جائے، آج کے قانونی و اخلاقی مباحث کو براہِ راست اس دور کے واقعات پر منطبق کرنا علمی لحاظ سے درست نہیں، اور نہ ہی ان تاریخی واقعات سے آج کسی فرد یا گروہ کے لیے کوئی عمل جائز قرار دینا اس گائیڈ کا مقصد ہے۔

نتیجہ

اختتام پر کہا جا سکتا ہے کہ سریہ اس عسکری دستے کو کہتے ہیں جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کی قیادت میں بھیجتے تھے اور خود اس میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ سریہ حمزہ بن عبدالمطلب سن ایک ہجری کا پہلا بڑا سریہ تھا جو سیف البحر تک گیا، سفید پرچم اسی سے وابستہ ہوا اور یہ مہم ثالثی کے ذریعے بغیر جنگ کے ختم ہوئی مگر اس نے قریش پر معاشی و نفسیاتی دباؤ اور مدینہ کی ریاست کی موجودگی کا پیغام دے دیا۔ سریہ عبداللہ بن رواحہ سن چھ ہجری میں خیبر کی طرف بھیجا گیا جہاں مدینہ کے خلاف تیاریوں کی اطلاعات تھیں، اور یہ مہم سرحدی دفاع اور اطلاعاتی پالیسی کی کامیاب مثال بنی۔ دونوں سرایا سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی دفاعی پالیسی میں سرایا آنکھ اور کان کا کام کرتے تھے، اصل مقصد ریاست اور شہریوں کا تحفظ تھا اور جہاں صلح و گفتگو سے کام چل جائے وہاں جنگ کو ٹالنا ہی سیرت کی پہچان تھی۔

سوال نمبر 2: غزوہ بدر و احد کی روشنی میں جغرافیہ اور جنگی حکمتِ عملی (20 نمبر)

سوال نمبر 2: غزوہ بدر اور غزوہ اُحد کے تناظر میں واضح کریں کہ میدانِ جنگ کی جغرافیائی صورتِ حال جنگی حکمتِ عملی میں کس حد تک مؤثر کردار ادا کرتی ہے؟ (20)

تعارف

جنگی تاریخ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جنگ صرف سپاہیوں کی تعداد اور ہتھیاروں سے نہیں جیتی جاتی بلکہ میدان کا جغرافیہ، پانی اور بلندی جیسے عوامل، موسم اور رسد کے راستے بھی نتیجہ طے کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بڑے غزوات بدر اور احد اس اصول کی سب سے واضح تاریخی مثالیں ہیں۔ بدر میں مسلمان تعداد میں تین گنا کم تھے مگر میدان کے درست انتخاب اور حکمتِ عملی نے توازن بدل دیا، جبکہ احد میں ابتدائی کامیابی کے باوجود ایک درے کی حفاظت چھوٹ جانے سے نقشہ الٹ گیا۔ ان دونوں واقعات کو ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیہ کوئی غیر جانبدار پس منظر نہیں بلکہ حکمتِ عملی کا فعال جزو ہے۔ اس جواب میں پہلے جغرافیہ اور حکمتِ عملی کے تعلق کے عمومی اصول بیان کیے جائیں گے، پھر بدر کے میدان کا تجزیہ کیا جائے گا، اس کے بعد احد کے میدان کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں تقابلی صورت میں وہ اسباق نکالے جائیں گے جو آج بھی عسکری منصوبہ بندی میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بحث خالصتاً تاریخی و تجزیاتی ہے۔

جغرافیہ اور حکمتِ عملی کا تعلق: عمومی اصول

عسکری ماہرین میدانِ جنگ کے تجزیے میں چند عناصر کو ہمیشہ دیکھتے ہیں۔ پہلا عنصر بلندی ہے، کیونکہ اونچی جگہ سے دشمن کی نقل و حرکت نظر آتی ہے اور تیر اندازی و دفاع میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرا عنصر پانی ہے، خاص طور پر صحرائی ماحول میں جس فوج کے پاس پانی ہو وہ زیادہ دیر ٹھہر سکتی ہے اور جس کے پاس نہ ہو وہ منتشر ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ تیسرا عنصر عقب یعنی پیچھے کی حفاظت ہے کہ دشمن گھوم کر پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ چوتھا عنصر رسد اور واپسی کے راستے ہیں کہ لشکر کو خوراک ملتی رہے اور ضرورت پڑنے پر اگلی پوزیشن تک رسائی ممکن ہو۔ پانچواں عنصر زمین کی ساخت ہے، ریتلی زمین، پہاڑی درے اور کھلی وادی ہر ایک الگ حکمتِ عملی مانگتا ہے۔ چھٹا عنصر موسم اور ہوا و سورج کی سمت بھی ہے جس سے لڑنے والوں کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ بدر و احد دونوں میں یہی عناصر فیصلہ کن بنے۔ فرق یہ ہے کہ بدر میں ان عوامل کو درست سمجھ کر فائدہ اٹھایا گیا جبکہ احد میں ایک اہم عامل یعنی درے کی حفاظت میں کوتاہی نے بحران پیدا کر دیا۔ اس موازنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیائی فائدہ خود کار نہیں ہوتا، یہ قیادت کے فیصلے اور سپاہیوں کے نظم و ضبط سے جڑا ہوتا ہے۔

غزوہ بدر: میدان کا انتخاب اور پانی کی حکمتِ عملی

غزوہ بدر سن دو ہجری، رمضان المبارک میں پیش آیا۔ بدر مدینہ سے جنوب مغرب میں واقع ایک مقام تھا جہاں کنویں موجود تھے اور شام سے مکہ جانے والے تجارتی راستے کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت پہلے سے قائم تھی۔ مسلمانوں کی تعداد روایات کے مطابق تین سو تیرہ تھی جبکہ قریش کا لشکر تقریباً ایک ہزار تھا۔ میدان میں پہنچنے کے بعد ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو جغرافیائی شعور کی بہترین مثال ہے۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ پڑاؤ کیا ہے، کیا یہ وحی کی بنیاد پر ہے یا رائے و تدبیر ہے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ تدبیر کا معاملہ ہے تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آگے بڑھ کر دشمن کے قریب ترین کنویں پر قبضہ کیا جائے، باقی کنوؤں کو بند کر دیا جائے اور اپنے لیے حوض بنا کر پانی جمع کر لیا جائے، تاکہ ہم پانی پیتے رہیں اور دشمن محروم رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورے کو پسند فرما کر اسی پر عمل کیا۔ اس ایک فیصلے نے صحرائی جنگ کی سب سے بڑی ضرورت یعنی پانی کو مسلمانوں کے حق میں کر دیا۔ اس سے یہ رائے کا اصول بھی واضح ہوا کہ زمینی حقائق کے ماہر کی رائے کو قیادت نے عزت دی۔

بدر میں مزید جغرافیائی و ماحولی عوامل

بدر کے میدان میں کچھ دیگر عوامل بھی مسلمانوں کے حق میں گئے۔ بارش ہونے سے وادی کی ریت جم گئی جس سے مسلمانوں کے قدم مضبوط ہوئے جبکہ دشمن کی طرف زمین کیچڑ والی ہو گئی اور ان کی نقل و حرکت مشکل ہو گئی۔ قرآن مجید میں سورۃ الانفال کے مفاہیم میں اس بارش کو مسلمانوں کے لیے طہارت، قدموں کی مضبوطی اور دلوں کے اطمینان کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ماحولی عوامل بھی جنگ کے نتیجے میں شریک تھے۔ صف بندی اس طرح کی گئی کہ سورج کی روشنی مسلمانوں کی آنکھوں پر پڑنے کے بجائے دشمن کے لیے زحمت بنے۔ کم تعداد کے باوجود مسلمانوں کی صفیں منظم تھیں اور میدان کے اس حصے پر گرفت تھی جہاں سے پانی اور بلندی دونوں کا فائدہ مل رہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کے بڑے سردار مارے گئے، ان کا لشکر منتشر ہوا اور مسلمانوں کو فیصلہ کن کامیابی ملی۔ یہاں طالب علم کو سمجھنا چاہیے کہ بدر کی فتح کو

سیرت میں اللہ کی مدد کے ساتھ ساتھ درست تدبیر، مشورے کی قبولیت اور میدان کی سمجھ سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ دونوں پہلو ساتھ ساتھ چلتے ہیں، تدبیر کرنا ایمان کے منافی نہیں بلکہ اسی کا تقاضا ہے۔

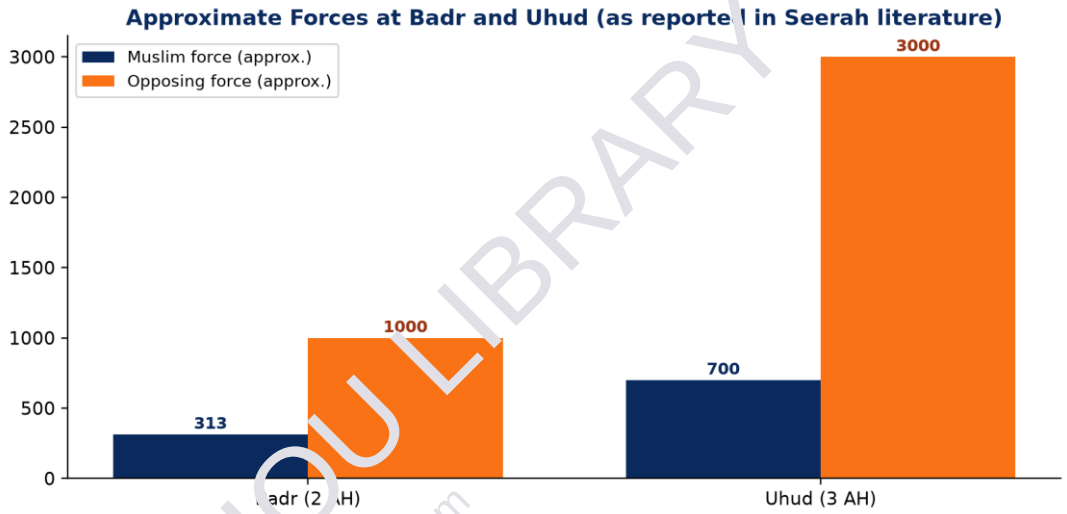

شکل: بدر و احد میں دونوں فریقوں کی تقریبی تعداد (سیرت کی روایات کے مطابق)

غزوہ احد: جبلِ احد، درہ اور تیر انداز

غزوہ احد سن تین ہجری میں مدینہ کے قریب جبلِ احد کے دامن میں پیش آیا۔ اس بار قریش تقریباً تین ہزار کے لشکر کے ساتھ آئے اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً سات سو تھی۔ میدان کے انتخاب میں مدینہ کے قریب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو شہر کی نزدیکی کا فائدہ تھا مگر اسی سے یہ خطرہ بھی تھا کہ شکست کی صورت میں شہر براہِ راست زد میں آ جاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی صف بندی اس انداز سے کی کہ جبلِ احد پشت پر رہے تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ پہاڑ کے ایک درے یعنی شعب پر، جو بعد میں جبلِ الرماۃ کے نام سے مشہور ہوا، حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس تیر انداز مقرر فرمائے اور سخت تاکید فرمائی کہ چاہے ہم غالب آئیں یا دشمن، اپنی جگہ نہ چھوڑنا، کیونکہ دشمن کے سوار اسی درے سے گھوم کر پیچھے آ سکتے تھے۔ یہ ہدایت خالص جغرافیائی حکمتِ عملی تھی؛ درہ وہ واحد راستہ تھا جو پوری صف بندی کو ناکام بنا سکتا تھا۔ جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو کامیابی ملی اور دشمن پسپا ہونے لگا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب جغرافیائی منصوبہ اپنی جگہ درست کام کر رہا تھا۔

درہ خالی ہونے کے نتائج اور تجزیہ

جب دشمن پسپا ہوا تو درے پر مقرر تیر اندازوں کی اکثریت نے یہ سمجھا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور وہ مالِ غنیمت کے خیال سے اپنی پوزیشن چھوڑ کر نیچے آ گئے، حالانکہ ان کے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حکم یاد دلایا۔ ان کے ساتھ صرف چند افراد رہ گئے۔ اسی خالی درے سے خالد بن ولید، جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے سوار دستے کے ساتھ گھوم کر آئے اور پیچھے سے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی صفیں، جو آگے بڑھ چکی تھیں، دو طرفہ دباؤ میں آ گئیں اور فتح شکست کے قریبی بحران میں بدل گئی۔ ستر کے قریب صحابہ شہید ہوئے جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے۔ اس واقعے کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیائی منصوبہ اس وقت تک کامیاب تھا جب تک اس پر عمل ہوا؛ بحران نقشے کی خرابی سے نہیں بلکہ کلیدی مقام کی حفاظت ترک کرنے سے پیدا ہوا۔ قرآن مجید میں سورۃ آلِ عمران کے مفاہیم میں اس واقعے کو امت کے لیے مستقل سبق کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ناکامی کی وجہ اندرونی لوگ ہی تھی۔ اس لیے احد کو جغرافیہ کی اہمیت کی منفی مثال کہنا زیادہ درست ہے کہ ایک درے نے پورے میدان کی قسمت بدل دی۔

جدول: بدر و احد میں جغرافیائی عوامل کا تقابل

عامل	بدر (2ھ)	احد (3ھ)
پانی / اہم وسیلہ	کنوؤں پر قبضہ، حوض کی تیاری	شہر کی نزدیکی، مگر درہ کلیدی نکتہ
بلندی و پشت	مناسب پڑاؤ و صف بندی	جبلِ احد پشت پر، دفاع مضبوط
کلیدی کمزور مقام	دشمن کو پانی سے محرومی	جبلِ الرماۃ کا درہ، حفاظت ترک ہونے سے بحران
قیادت و نظم	حباب بن منذر کے مشورے پر عمل	تیر اندازوں کی اکثریت کا پوزیشن چھوڑنا
نتیجہ	فیصلہ کن کامیابی	ابتدائی کامیابی کے بعد بھاری نقصان

عمومی اسباق اور نتیجہ

دونوں غزوات کے تقابل سے چند مستقل اسباق نکلتے ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ میدان کا انتخاب جنگ سے پہلے ہی آدھی جنگ طے کر دیتا ہے، اس لیے پانی، بلندی اور عقب کی حفاظت کا جائزہ ہر منصوبے کی بنیاد ہونا چاہیے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ ماہرین کی رائے سننا قیادت کی شان ہے، جیسا کہ بدر میں حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ قبول ہوا۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ بہترین منصوبہ بھی نظم و ضبط کے بغیر ناکام ہو سکتا ہے، جیسا کہ احد میں ہوا؛ اس لیے کلیدی مقامات پر مقرر افراد کی ذمہ داری نتیجے تک جاری رہتی ہے، درمیان میں ختم نہیں ہوتی۔ چوتھا سبق یہ ہے کہ کامیابی کے لمحے میں احتیاط سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے کیونکہ دشمن اسی غفلت کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ پانچواں سبق یہ ہے کہ شکست کی صورت میں بھی اس کی وجوہات کا ایماندارانہ تجزیہ کرنا قیادت کی ذمہ داری ہے، جس کی مثال احد کے بعد کے قرآنی تجزیے اور سیرت کے رویے میں ملتی ہے۔ اختتام پر کہا جا سکتا ہے کہ جغرافیائی صورتِ حال جنگی حکمتِ عملی میں فیصلہ کن حد تک مؤثر ہوتی ہے؛ بدر اس کے مثبت اور احد اس کے منفی استعمال کی زندہ مثال ہے۔ طالب علم کے لیے یہ تجزیہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سیرت کا مطالعہ صرف واقعات یاد کرنا نہیں بلکہ ان سے اصول اخذ کرنا ہے، اور یہ اصول زمانہ قدیم سے آج تک ہر سنجیدہ عسکری منصوبہ بندی میں موجود ہیں۔

سوال نمبر 3: انسانی جان و مال اور بنیادی حقوق کے تحفظ میں ریاست کی ذمہ داریاں (20 نمبر)

سوال نمبر 3: انسانی جان و مال اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے ریاست کی ذمہ داریوں پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مضمون لکھیں۔ (20)

تعارف

اسلامی تعلیمات میں ریاست کا اصل مقصد طاقت جمع کرنا نہیں بلکہ انسان کی جان، مال، عقل، عزت اور نسل سمیت اس کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہے۔ علماء نے مقاصدِ شریعت کی بحث میں ان پانچ ضروریات کی حفاظت کو شریعت کے بڑے مقاصد میں شمار کیا ہے جن پر انسانی زندگی کا نظام قائم ہے۔ جب یہ مقاصد سامنے رکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری محض ٹیکس لینا اور سرحدوں کی حفاظت کرنا نہیں بلکہ شہری کی روزمرہ زندگی کو امن، انصاف اور وقار فراہم کرنا ہے۔ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ

وسلم اور خلافتِ راشدہ کی تاریخ اس ذمہ داری کی عملی مثالیں پیش کرتی ہے۔ اس مضمون میں پہلے جان کے تحفظ، پھر مال کے تحفظ اور پھر دیگر بنیادی حقوق کے سلسلے میں ریاست کی ذمہ داریوں پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بحث کی جائے گی اور آخر میں نفاذ کے تقاضوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ بحث اصولی و تعلیمی ہے؛ مخصوص قانونی معاملات میں رائے دینا عدالتوں اور اہلِ علم کا کام ہے۔

انسانی جان کا تحفظ: ریاست کی پہلی ذمہ داری

قرآن مجید میں انسانی جان کی حرمت کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ سورۃ المائدہ میں اس مفہوم کو بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کا ناحق قتل پوری انسانیت کے قتل کے مانند ہے اور ایک جان بچانا پوری انسانیت کو زندگی دینے کے مانند ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء اور دیگر مقامات پر مومن کی جان کی حرمت اور قصاص کے نظام کے مفاہیم سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون کی نظر میں ہر جان قیمتی ہے۔ اس تعلیم سے ریاست کی پہلی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ مؤثر قانون نافذ کرے جو ہر قسم کے قتل، حملے اور تشدد کی روک تھام ہو، پولیس و عدلیہ کا ایسا منصفانہ نظام قائم کرے کہ مظلوم کو انصاف ملے اور ظالم کو سزا کا یقین ہو۔ سیرت و خلافت کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ خون کے مقدمات میں قبیلے یا دولت کی رعایت نہیں کی گئی اور یہ اصول بیان ہوا کہ قانون کی بالادستی کے بغیر ریاست قائم نہیں رہ سکتی۔ جان کے تحفظ میں صحت کی سہولتیں، وباؤں سے بچاؤ، سڑکوں کی حفاظت اور قدرتی آفات میں امداد بھی شامل ہیں، کیونکہ جدید ریاست میں جان کی حفاظت کا دائرہ صرف جرائم کی روک تھام تک محدود نہیں رہا۔ عہدِ نبوی میں مدینہ کو حرم قرار دے کر اس کے اندر خون ریزی ممنوع کرنا بھی اسی ذمہ داری کی ابتدائی اور علامتی صورت تھی جو میثاقِ مدینہ میں تحریر کی گئی۔

مال کا تحفظ: ریاست کی معاشی ذمہ داری

اسلامی تعلیمات میں مال بھی جان کی طرح محترم ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع کے مفہوم میں جان اور مال کی حرمت کو کعبہ اور یومِ عرفہ کی حرمت کی طرح قرار دیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے مال پر ناجائز قبضہ بھی اتنا ہی سنگین ہے جتنا اس کی جان پر حملہ۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھانے کی ممانعت اور سورۃ البقرہ سمیت دیگر مقامات پر سود، رشوت اور دھوکے کی مذمت اسی اصول کی تفصیل ہے۔ ان تعلیمات سے ریاست کی ذمہ داریاں یہ بنتی ہیں کہ وہ چوری و ڈکیتی کے خلاف

قانون نافذ کرے، سود و رشوت اور ملاوٹ و احتکار جیسے معاشی جرائم کی روک تھام کرے، ناپ تول اور معاہدوں کی نگرانی کرے جیسا کہ بازارِ مدینہ کے مطالعے میں گزرا اور ٹیکس و محصول بھی عدل کے ساتھ لگائے کیونکہ ظالمانہ ٹیکس بذاتِ خود مال پر زیادتی بن جاتا ہے۔ اسی ذمہ داری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ریاست نادار شہریوں کے لیے زکوٰۃ، اوقاف اور فلاحی نظام کے ذریعے بنیادی ضروریات کا بندوبست کرے، تاکہ غربت سے پیدا ہونے والے جرائم بھی کم ہوں اور ہر شہری باعزت زندگی گزار سکے۔ خلیفہ دوم کے دور میں بیت المال سے وظائف اور عہدِ نبوی میں صفہ کے نادار افراد کی کفالت اس ذمہ داری کی ابتدائی مثالیں ہیں۔

بنیادی حقوق: عزت، مذہب، عدل اور تعلیم

جان و مال سے آگے اسلامی تعلیمات انسانی وقار کو بھی بنیادی حق قرار دیتی ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الحجرات میں اولادِ آدم کی تکریم کا مفہوم بیان ہوا ہے جو رنگ، نسل اور زبان سے بالاتر اصول ہے۔ اس سے ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ شہری کی عزتِ نفس کی حفاظت کرے، جھوٹے الزام، غیبت و تہمت کے سماجی جرائم کی حوصلہ شکنی کرے اور قانون کے سامنے سب کو برابر رکھے۔ مذہبی آزادی بھی بنیادی حقوق میں شامل ہے؛ سورۃ البقرہ میں دین میں جبر نہ ہونے کا مفہوم بیان ہوا ہے اور میثاقِ مدینہ میں غیر مسلم شہریوں کو دین پر قائم رہنے کی ضمانت دی گئی۔ اس سے ریاست پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ اقلیتوں کی عبادت گاہوں اور جان و مال کی حفاظت کرے اور انہیں شہری حقوق میں محروم نہ کرے۔ عدل تک رسائی بھی بنیادی حق ہے؛ قرآن مجید میں سورۃ النساء میں عدل پر قائم رہنے کے حکم کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ انصاف ذاتی پسند و ناپسند سے اوپر ہے، لہٰذا ریاست پر فرض ہے کہ عدالتیں آزاد اور مؤثر ہوں اور غریب بھی انصاف حاصل کر سکے۔ تعلیم بھی بنیادی حق ہے کیونکہ علم حاصل کرنے کی ترغیب اسلام کی پہچان ہے، اس لیے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم کے مواقع فراہم کرے، جیسا کہ مدینہ میں مسجدِ نبوی اور صفہ علم کے مراکز تھے اور بدر کے قیدیوں سے لکھا پڑھا سکھانے کا کام لیا گیا۔ اظہار و مشورے کا حق بھی شوریٰ کے اصول سے ثابت ہوتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ شہری پرامن طریقے سے اپنی رائے اور شکایت ذمہ داروں تک پہنچا سکے۔

جدول: بنیادی حقوق اور ریاست کی متعلقہ ذمہ داریاں

ریاست کی ذمہ داری	اسلامی تعلیم کی بنیاد (مفہوم)	حق
قانون نافذ کرنا، منصفانہ سزا و انصاف، صحت و ہنگامی امداد	ایک جان کا قتل پوری انسانیت کا قتل	جان کا تحفظ
چوری و کرپشن کی روک تھام، عادلانہ ٹیکس، فلاحی کفالت	جان و مال کی حرمت، ناحق مال کھانے کی ممانعت	مال کا تحفظ
مساوات، الزام و تذلیل کی ممانعت	بنی آدم کی تکریم	عزت و وقار
اقلیتوں کی عبادت و جان و مال کا تحفظ	دین میں جبر نہیں، میثاقِ مدینہ کی ضمانت	مذہبی آزادی
آزاد عدلیہ، تعلیم کے مساوی مواقع	عدل پر قیام، علم کی ترغیب	عدل و تعلیم

غیر مسلم شہری اور کمزور طبقات کا خصوصی تحفظ

اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں کمزور طبقات کا تحفظ خاص جگہ رکھتا ہے۔ حدیث کے مفہوم میں ریاست کے حاکم کو رعایا کا نگہبان اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ قرار دیا گیا ہے، جس سے حکومت کی ذمہ داری صرف مضبوط طبقات تک نہیں رہتی بلکہ یتیم، بیوہ، معذور، مزدور اور بوڑھے شہری بھی اس میں برابر کے حق دار بن جاتے ہیں۔ غیر مسلم شہریوں کے بارے میں سیرت و خلافت کی تاریخ میں واضح مثالیں موجود ہیں کہ ان کی جان و مال پر حملہ مسلمان شہری پر حملے کی طرح سنگین سمجھا گیا اور ان کے ساتھ معاہدے کی حفاظت کو ریاست نے اپنی عزت کا مسئلہ بنایا۔ اس پس منظر میں پاکستان جیسے ملک کے لیے بھی سبق یہی ہے کہ اقلیتوں کا تحفظ محض آئینی شق نہیں بلکہ دینی و اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق، مزدور کی اجرت کی بروقت ادائیگی اور بچوں کے تحفظ کو بھی ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں شمار کرنا چاہیے، کیونکہ سیرت

کی تعلیمات میں کمزور کے حق کو ہمیشہ آگے رکھا گیا ہے۔ ان نکات کو لکھنے کا مقصد کسی مخصوص قانون کی تشریح نہیں بلکہ وہ اصول واضح کرنا ہے جن کی روشنی میں شہری اپنے حقوق اور ریاست سے اپنی توقعات کو سمجھ سکے۔

نفاذ کے تقاضے اور عملی مشکلات

حقوق کے اعلان اور ان کے نفاذ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات نفاذ کے لیے چند تقاضے پیش کرتی ہیں۔ پہلا تقاضا یہ ہے کہ حکمران خود قانون کے تابع ہو، کیونکہ قانون سے بالاتر قیادت حقوق کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ خلافتِ راشدہ میں خلیفہ کا عدالت میں پیش ہونا اس کی تاریخی مثال ہے۔ دوسرا تقاضا اداروں کی ایمانداری ہے؛ اگر نافذ کرنے والے ادارے ہی رشوت اور سفارش کا شکار ہوں تو بہترین قانون بھی بے اثر ہو جاتا ہے، اس لیے احتساب ریاست کے اندر سے شروع ہونا چاہیے۔ تیسرا تقاضا شہریوں کی تربیت ہے کہ وہ حقوق کے ساتھ فرائض بھی پہچانیں، کیونکہ دوسرے کے حق کا احترام کیے بغیر اپنے حق کا تحفظ ممکن نہیں۔ چوتھا تقاضا یہ ہے کہ شکایت کا آسان نظام موجود ہو اور مظلوم کو انصاف کے لیے برسوں انتظار نہ کرنا پڑے۔ پاکستان سمیت کئی مسلم ممالک میں اصل مسئلہ اصولوں کی کمی نہیں بلکہ نفاذ کی کمزوری ہے؛ آئین میں حقوق موجود ہیں مگر تھانے، عدالت اور بازار میں شہری کو وہ تحفظ ہمیشہ نہیں ملتا۔ اس لیے ریاست کی ذمہ داری پر بحث کا اصل حاصل یہ ہے کہ اصولوں کو اداروں، بجٹ اور تربیت کے ذریعے زمین پر اتارا جائے۔ سیرت ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ مدینہ میں حقوق صرف اعلان نہیں تھے بلکہ میثاق، عدالت، محتسب اور حکمران کے ذاتی عمل سے نافذ ہو کر دکھائے گئے تھے۔

نتیجہ

اختتام پر خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ریاست کی سب سے بنیادی ذمہ داری انسانی جان کی حفاظت ہے، اس کے بعد مال کی حفاظت اور پھر عزت، مذہبی آزادی، عدل، تعلیم اور مشورے جیسے حقوق کا تحفظ آتا ہے۔ یہ ذمہ داریاں محض قانونی نہیں بلکہ دینی و اخلاقی بھی ہیں، کیونکہ حکمران کو رعایا کے بارے میں جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ نے ان اصولوں کی عملی شکل دکھائی کہ کمزور ترین شہری بھی ریاست سے انصاف کی توقع رکھ سکتا تھا۔ آج کے دور میں ان

اصولوں کا تقاضا ہے کہ ریاست مؤثر قانون، صاف ستھرے ادارے، فلاحی نظام اور باشعور شہریوں کے ذریعے ان حقوق کو حقیقت بنائے۔ جو ریاست اپنے شہریوں کی جان، مال اور وقار کی حفاظت کرتی ہے وہی دراصل اسلامی تعلیمات کے سیاسی مقصد یعنی عدل و امن کے قیام کو پورا کرتی ہے، اور یہی وہ معیار ہے جس پر ہر نظام کو پرکھا جانا چاہیے۔

سوال نمبر 4: مسلمانوں کی سیاست کے مقاصد اور پاکستانی سیاسی پارٹیوں کے لیے راہنما اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 4: مسلمانوں کی سیاست کے مقاصد پر سیرتِ طیبہ کی روشنی میں تفصیلی نوٹ لکھیں نیز پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے لئے راہنما اصول متعین کریں۔ (20)

تعارف

عام طور پر سیاست کا لفظ اقتدار کی کشمکش، پارٹی بازی اور انتخابی مقابلے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، مگر سیرتِ طیبہ کی روشنی میں سیاست کا مفہوم اس سے کہیں وسیع اور بلند ہے۔ عربی میں سیاست کے بنیادی مفاہیم میں معاملات کی اصلاح اور رعایا کے امور کی بہتر تدبیر شامل ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی اسی اصلاح و تدبیر کی کامل مثال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست قائم کی، معاہدے کیے، سفراء بھیجے، انصاف قائم کیا اور معاشرے کے کمزور طبقات کی کفالت کا نظام بنایا۔ ان تمام سرگرمیوں کو اگر ایک لفظ میں سمیٹا جائے تو وہ خدمت اور عدل ہے، نہ کہ ذاتی اقتدار۔ سوال یہ ہے کہ سیرت کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاست کے مقاصد کیا ہونے چاہئیں اور ان مقاصد سے پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے لیے کون سے راہنما اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس جواب میں پہلے مقاصد تفصیل سے بیان کیے جائیں گے، پھر پارٹیوں کے لیے اصول متعین کیے جائیں گے۔ یہ تجزیہ تعلیمی ہے؛ کسی مخصوص پارٹی یا فرد پر فتویٰ یا حکم لگانا اس کا مقصد نہیں۔

سیاست کے مقاصد: عدل کا قیام اور ظلم کا خاتمہ

سیرت کی روشنی میں سیاست کا پہلا اور سب سے بڑا مقصد عدل کا قیام ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء میں لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے کے حکم کا مفہوم اور سورۃ المائدہ میں دشمنی کے باوجود عدل سے نہ ہٹنے کی تلقین اس مقصد کی بنیاد ہے۔ مدینہ کی ریاست میں یہ عدل محض دعویٰ نہیں تھا؛ تنازعات کا فیصلہ ایک مرجع کرتا تھا، جرم

کی سزا فرد کو ملتی تھی اور بڑے قبیلے کا فرد بھی قانون سے بالاتر نہیں تھا۔ دوسرا مقصد ظلم کا خاتمہ اور مظلوم کی دادرسی ہے، جس کی عملی شکل میثاقِ مدینہ، حلف الفضول کی تائید اور ہر کمزور شہری کے حق کی حفاظت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تیسرا مقصد امنِ عامہ کا قیام ہے، کیونکہ ترقی، عبادت اور تعلیم سب امن کے محتاج ہیں؛ مدینہ کو حرم قرار دینا اور سرحدی معاہدے اسی مقصد کی مثالیں ہیں۔ چوتھا مقصد انسانی فلاح ہے، یعنی لوگوں کی معاشی و سماجی بہتری، جس کے لیے بازار کا منظم نظام، زکوٰۃ و اوقاف کی ابتدائی صورتیں اور صفہ کے ناداروں کی کفالت قائم کی گئی۔ پانچواں مقصد وحدت اور انتشار کا خاتمہ ہے؛ اوس و خزرج جیسے حریف قبائل کو ایک امت میں جوڑنا سیرت کی سیاست کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ چھٹا مقصد دین و اخلاق کی سربلندی ہے، اس اصول کے ساتھ کہ ہر کام راستہ حکمت، نرمی اور مثال سے ہو، جبر و بدنظمی سے نہیں۔ ان مقاصد کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کی سیاست دراصل اقتدار کو مقصد کے بجائے وسیلہ سمجھتی ہے، اور اصل امتحان یہ ہے کہ اقتدار ملنے کے بعد عدل و خدمت میں کتنا اضافہ ہوا۔

شوریٰ، احتساب اور اہلیت: مقاصد کے عملی ستون

ان مقاصد کے حصول کے لیے سیرت نے تین عملی ستون بھی دیے ہیں۔ پہلا ستون شوریٰ ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ میں مومنوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہونے کا مفہوم بیان ہوا ہے اور سیرت میں بدر کے پڑاؤ، احد کی حکمتِ عملی اور خندق کی کھدائی جیسے فیصلوں میں مشورہ عملی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس سے سیاست کا اصول نکلتا ہے کہ فیصلے بند کمروں اور ذاتی ضد سے نہیں بلکہ اہلِ رائے کے مشورے سے ہوں۔ دوسرا ستون احتساب ہے۔ حکمران سے سوال کرنا مدینہ کے معاشرے میں زندہ روایت تھی اور خلافتِ راشدہ میں یہ اصول اپنے عروج پر نظر آتا ہے کہ خلیفہ بھی عوامی سوال کا جواب دیتا تھا۔ سیاست میں اس کا مطلب شفافیت ہے کہ اقتدار امانت ہے اور اس کا حساب دینا پڑے گا۔ تیسرا ستون اہلیت و امانت ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء میں امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کرنے کے حکم کا مفہوم سیاسی تقرریوں کا سنہرا اصول ہے۔ سیرت میں عمال و سفراء کا انتخاب بھی اہلیت دیکھ کر ہوتا تھا۔ جو سیاست ان تین ستونوں سے خالی ہو وہ مقاصد کے دعوے کے باوجود بالآخر ذاتی مفادات کا کھیل بن جاتی ہے، جبکہ سیرت کی سیاست ان تینوں کی موجودگی سے پہچانی جاتی ہے۔ طالب علم کے لیے یہ حصہ خاص طور پر اہم ہے کیونکہ یہی تین اصول آگے پارٹیوں کے لیے راہنما اصولوں کی بنیاد بنیں گے۔

پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے لیے راہنما اصول: پہلا حصہ

سیرت کے ان مقاصد و اصولوں کی روشنی میں پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے لیے درج ذیل راہنما اصول متعین کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ پارٹی کا اصل منشور اقتدار نہیں بلکہ عدل و خدمت ہو؛ ہر پارٹی کو اپنے پروگرام میں انصاف کی فراہمی، مہنگائی و بے روزگاری کا حل اور کمزور طبقات کی فلاح کو واضح اہداف کے ساتھ بیان کرنا چاہیے اور اقتدار میں آ کر ان کی رپورٹ بھی عوام کے سامنے رکھنی چاہیے۔ دوسرا اصول پارٹی کے اندر شوریٰ و جمہوریت ہے؛ جو پارٹی اپنے اندر مشورہ اور انتخاب نہیں کرتی وہ ملک میں بھی جمہوری اقدار کو مضبوط نہیں کر سکتی، اس لیے اندرونی انتخابات اور اجتماعی فیصلے لازم ہونے چاہئیں۔ تیسرا اصول اہلیت و امانت کی بنیاد پر ٹکٹ و عہدوں کی تقسیم ہے؛ خاندان، دولت یا سفارش کے بجائے کردار و قابلیت معیار ہو۔ چوتھا اصول مالی شفافیت ہے؛ پارٹی کے فنڈز، عطیات اور اخراجات کا باقاعدہ حساب عوام کے اعتماد کی بنیاد ہے، بالکل اسی طرح جیسے بیت المال کی امانت مدینہ میں ریاست کا وقار تھی۔ پانچواں اصول سیاسی رواداری اور پرامن مقابلہ ہے؛ مخالف کو دشمن سمجھنے، الزام تراشی اور تشدد کی سیاست سیرت کے مقاصد سے متصادم ہے، کیونکہ مدینہ میں اختلاف کو معاہدے اور قانون کے دائرے میں رکھا گیا تھا۔ چھٹا اصول آئین و قانون کی بالادستی کی پاسداری ہے؛ پارٹی اقتدار میں ہو یا اپوزیشن میں، آئینی طریقہ ہی واحد راستہ ہونا چاہیے۔

پاکستانی پارٹیوں کے لیے راہنما اصول: دوسرا حصہ

ساتواں اصول یہ ہے کہ پارٹی اپنے کارکنوں کی اخلاقی تربیت کرے۔ مدینہ کی جماعت کی اصل طاقت کردار تھی، اس لیے سیاسی کارکن کی تربیت میں سچائی، وعدے کی پاسداری اور عوام سے عزت سے پیش آنا شامل ہونا چاہیے۔ آٹھواں اصول اقلیتوں اور کمزور طبقات کی نمائندگی و تحفظ ہے؛ میثاقِ مدینہ کی روشنی میں کوئی پارٹی اپنی سیاست کو مکمل نہیں کہہ سکتی اگر اس کے پروگرام میں اقلیتوں کے حقوق اور پسے ہوئے علاقوں کی ترقی شامل نہ ہو۔ نواں اصول احتساب کی قبولیت ہے؛ پارٹی قیادت کو پارٹی کے اندر بھی اور ریاست کے اداروں کے سامنے بھی جواب دہ ہونا چاہیے اور کرپشن کے الزامات کو دشمنی کہہ کر رد کرنے کے بجائے شفاف تحقیقات کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دسواں اصول قومی وحدت کی حفاظت ہے؛ لسانی، علاقائی اور فرقہ وارانہ عصبیت پھیلا کر ووٹ لینا اسی جاہلی عصبیت کی جدید صورت ہے جسے اسلام نے ختم کیا تھا، لہٰذا ہر پارٹی کو پاکستان کی

وحدت کو اپنے مفاد پر مقدم رکھنا چاہیے۔ گیارھواں اصول میڈیا اور اظہار کے معاملے میں تحمل ہے کہ تنقید کا جواب دلیل سے دیا جائے، دباؤ یا تشدد سے نہیں۔ بارھواں اصول یہ ہے کہ نوجوانوں اور خواتین کو اہلیت کی بنیاد پر آگے لایا جائے تاکہ سیاست چند خاندانوں تک محدود نہ رہے۔ یہ بارہ اصول کوئی خیالی فہرست نہیں؛ ان میں سے ہر اصول کی جڑ سیرت کے کسی واقعے یا قرآنی اصول کے مفہوم میں موجود ہے، اور ان پر عمل کرنے والی جماعت ہی سیرت کی سیاسی وارث کہلا سکتی ہے۔

جدول: سیرت کے مقاصد اور پاکستانی پارٹیوں کے لیے حاصل اصول

سیرت کا مقصد / اصول	پارٹی کے لیے راہنما اصول
عدل کا قیام	انصاف و فلاح پر مبنی واضح منشور و کارکردگی رپورٹ
شوریٰ	پارٹی کے اندر انتخابات و اجتماعی فیصلے
امانت و اہلیت	میرٹ پر ٹکٹ و عہدے، مالی شفافیت
وحدت و اخوت	عصبیت سے پاک قومی سیاست، اقلیتوں کا تحفظ
احتساب	قیادت کی جواب دہی و کرپشن سے پاک کردار
خدمت	کارکنوں کی اخلاقی تربیت، کمزور طبقات کی نمائندگی

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سیرتِ طیبہ کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاست کے مقاصد اقتدار کی ہوس نہیں بلکہ عدل کا قیام، ظلم کا خاتمہ، امن، انسانی فلاح اور معاشرے کی وحدت ہیں، اور ان مقاصد کے عملی ستون شوریٰ، احتساب اور اہلیت و امانت ہیں۔ انہی اصولوں سے پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے لیے یہ راہنما لائن نکلتی ہے کہ وہ منشور میں خدمت کو مرکز بنائیں، اپنے اندر جمہوریت و شفافیت لائیں، میرٹ اور کردار کو معیار بنائیں، رواداری و آئین کی پاسداری اختیار کریں اور عصبیت و کرپشن سے خود کو پاک رکھیں۔ جو پارٹی ان

اصولوں پر جتنا عمل کرے گی وہ اتنی ہی سیرت کے سیاسی مقاصد سے قریب ہو گی۔ طالب علم کے لیے اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ وہ سیاست کو گالی کے بجائے خدمت کا ذریعہ سمجھے اور اپنے ووٹ و وابستگی کا فیصلہ بھی انہی اصولوں کی کسوٹی پر کرے، کیونکہ باشعور شہری ہی اچھی سیاست کی اصل ضمانت ہوتا ہے۔

سوال نمبر 5: جمہوریت، صدارتی نظام اور اسلام کا نظامِ حکومت: تعارف و خصوصیات (20 نمبر)

سوال نمبر 5: جمہوریت، صدارتی نظام اور اسلام کے نظامِ حکومت کے تعارف و خصوصیات پر جامع مضمون تحریر کریں۔ (20)

تعارف

انسان نے اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کے لیے تاریخ میں کئی نظامِ حکومت آزمائے ہیں۔ بادشاہت، اشرافیہ، آمریت، جمہوریت اور اس کی مختلف صورتیں انہی تجربات کا نام ہیں۔ موجودہ دور میں سب سے زیادہ زیرِ بحث تین تصورات ہیں: جمہوریت بطور اصولِ حکمرانی، صدارتی نظام بطور حکومتی ڈھانچہ، اور اسلام کا نظامِ حکومت بطور اصول و اقدار کا ایک جامع تصور۔ ان تینوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک کا تعارف اور اس کی خصوصیات الگ الگ بیان کی جائیں اور پھر ان کا تقابل کیا جائے، تاکہ طالب علم اصطلاحات کے اشتراک کے باوجود موجود اختلافات کو بھی سمجھ سکے۔ اس مضمون میں پہلے جمہوریت، پھر صدارتی نظام اور پھر اسلام کے نظامِ حکومت کا تعارف و خصوصیات بیان کی جائیں گی اور آخر میں تقابلی جائزہ و نتیجہ پیش کیا جائے گا۔ یہ مضمون علمی و وصفی ہے، کسی مخصوص ملک کے مخصوص آئینی تنازعے میں فریق بننا اس کا مقصد نہیں۔

جمہوریت: تعارف و خصوصیات

جمہوریت یونانی الاصل اصطلاح ہے جس کے معنی عوام کی حکومت کے ہیں۔ اس کی مشہور تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ عوام کی حکومت ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے ہو۔ تاریخی طور پر اس کی ابتدائی صورت قدیم یونان کے شہر ایتھنز میں نظر آتی ہے، مگر جدید جمہوریت کی تشکیل یورپ و امریکا کے سیاسی تجربات سے ہوئی اور بیسویں صدی

میں یہ دنیا کا غالب نظام بن گئی۔ جمہوریت کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ اول، اقتدار کا ماخذ عوام کی مرضی سمجھی جاتی ہے اور حکومت منتخب نمائندوں کے ذریعے بنتی ہے۔ دوم، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر باقاعدہ اور آزاد انتخابات ہوتے ہیں جن میں ایک سے زیادہ جماعتیں حصہ لیتی ہیں۔ سوم، قانون کی حکمرانی اور تحریری آئین کی بالادستی تسلیم کی جاتی ہے جس سے حکومت بھی پابند ہوتی ہے۔ چہارم، شہریوں کو اظہار، پریس، اجتماع اور مذہب کی آزادی سمیت بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور عدلیہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ پنجم، مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے تاکہ کوئی ایک ادارہ مطلق العنان نہ بن جائے۔ ششم، حکومت عوام اور پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے اور مدت پوری ہونے پر پرامن انتقالِ اقتدار ہوتا ہے۔ جمہوریت کی دو بڑی صورتیں ہیں: پارلیمانی نظام جس میں وزیرِ اعظم اصل انتظامی سربراہ ہوتا ہے، جیسے برطانیہ و پاکستان، اور صدارتی نظام جس کی تفصیل اگلے حصے میں آ رہی ہے۔ جمہوریت کی خوبی اس کی جواب دہی و شمولیت ہے جبکہ اس کی کمزوریوں میں اکثریت کے غلط استعمال، پیسے کا اثر اور قلیل مدتی مقبولیت پسندی کو شمار کیا جاتا ہے۔

صدارتی نظام: تعارف و خصوصیات

صدارتی نظام جمہوریت ہی کی ایک صورت ہے جس کا بہترین نمونہ ریاست ہائے متحدہ امریکا سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام میں صدر ریاست کا سربراہ بھی ہوتا ہے اور حکومت کا سربراہ بھی۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اول، صدر براہِ راست عوام کے ووٹ سے یا انتخابی کالج جیسے طریقے سے منتخب ہوتا ہے اور ایک مقررہ مدت، مثلاً امریکا میں چار سال، کے لیے عہدے پر رہتا ہے۔ دوم، مقننہ اور انتظامیہ کی مکمل علیحدگی ہوتی ہے؛ صدر پارلیمنٹ کا رکن نہیں ہوتا اور پارلیمنٹ اسے عدم اعتماد کے ووٹ سے نہیں ہٹا سکتی، البتہ سنگین آئین شکنی پر مواخذے یعنی امپیچمنٹ کا طریقہ موجود ہے۔ سوم، وزراء یعنی سیکرٹری صدر کے ماتحت ہوتے ہیں اور عموماً پارلیمنٹ کے ارکان نہیں ہوتے۔ چہارم، صدر کے پاس قانون سازی کو ویٹو کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور مقننہ بھی اس کی تجاویز رد کر سکتی ہے، یوں دونوں ایک دوسرے پر قدغن رکھتے ہیں جسے چیکس اینڈ بیلنسز کہا جاتا ہے۔ پنجم، عدلیہ آزاد ہوتی ہے اور اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی تقرری میں صدر و مقننہ دونوں کا کردار ہوتا ہے۔ اس نظام کی خوبی قیادت کا استحکام اور واضح ذمہ داری ہے، جبکہ کمزوری یہ ہے کہ صدر و مقننہ میں اختلاف ہو تو حکومتی جمود پیدا ہو سکتا ہے اور مطلق اکثریت کے بغیر قانون سازی مشکل ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں بھی آئینی تاریخ میں صدارتی نظام کی بحث آتی رہی ہے، مگر موجودہ آئینی ڈھانچہ بنیادی طور پر پارلیمانی ہے اور اس بحث کا اصولی جائزہ علمی دائرے ہی میں رہنا چاہیے۔

اسلام کا نظامِ حکومت: تعارف و خصوصیات

اسلام کا نظامِ حکومت کسی ایک جدید آئینی ڈھانچے کا نام نہیں بلکہ اصول و اقدار کا وہ مجموعہ ہے جس کی حدود میں مسلمان معاشرہ اپنے دور کے حالات کے مطابق حکومتی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیت حاکمیت کا تصور ہے کہ اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، جس کا عملی مطلب یہ ہے کہ انسانی قانون سازی بھی انصاف و فلاح کے اعلیٰ اصولوں اور شریعت کی حدود کی پابند ہے اور کوئی حکمران خود کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری خصوصیت شوریٰ ہے کہ معاملات باہمی مشورے سے طے ہوں؛ خلیفہ یا سربراہ کا انتخاب بیعت و مشاورت کے اصول پر استوار تاریخی عمل سے ہوتا تھا جس کی صورت ہر دور میں اہلِ حل و عقد کے انتخابی عمل سے متعین ہوئی۔ تیسری خصوصیت عدل ہے کہ حکومت کا سب سے بڑا فرض منصفانہ نظام قائم کرنا ہے۔ چوتھی خصوصیت احتساب ہے کہ حکمران سمیت ہر ذمہ دار اللہ اور عوام کے سامنے جواب دہ ہے، جس کی مثال خلافتِ راشدہ میں کھلے عام سوال و جواب کی روایت ہے۔ پانچویں خصوصیت قانون کی بالادستی ہے کہ امیر و غریب قانون کے سامنے برابر ہوں۔ چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ ریاست کی ذمہ داری میں دین و اخلاق کی حفاظت کے ساتھ ساتھ جان، مال، تعلیم، صحت اور فلاح سمیت مقاصدِ شریعت کی تکمیل شامل ہے، جن پر پچھلے سوال میں تفصیل آ چکی ہے۔ ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ غیر مسلم شہریوں کے حقوق کی تحریری ضمانت اور معاہدوں کی پاسداری اس نظام کا حصہ ہے۔ یوں اسلامی نظام اپنی روح میں آئینی، مشاورتی اور جواب دہ حکومت ہے، اگرچہ اس کی تاریخی ادارہ جاتی صورتیں زمانے کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔

جدول: تینوں نظاموں کا تقابلی خاکہ

پہلو	جمہوریت	صدارتی نظام	اسلامی نظامِ حکومت
اقتدار کا ماخذ	عوام کی مرضی	عوام کی مرضی (منتخب صدر)	حاکمیت اللہ کی، اختیار امانت کے طور پر عوامی مشاورت سے
سربراہ کا انتخاب	صورت کے مطابق مختلف	براہِ راست انتخاب، مقررہ مدت	بیعت و شوریٰ کے اصول پر، صورت ہر

دور میں متعین			
شریعت کے اصول و مقاصد کی حدود	آئین کی حدود	آئین کی حدود	قانون سازی کی حد
اللہ کے سامنے جوابدہی، عوامی وعدالتی احتساب	مواخذہ، عدلیہ، انتخابات	پارلیمنٹ، عدلیہ، انتخابات	احتساب
عدل، شوریٰ و قانون کی بالادستی	استحکام و اختیارات کی تقسیم	نمائندگی و آزادی	بنیادی خصوصیت

تقابلی جائزہ اور نتیجہ

تینوں نظاموں کا تقابل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت و صدارتی نظام باہم جڑے ہوئے ہیں، کیونکہ صدارتی نظام جمہوریت کے اندر رہی کی ایک ڈھانچہ جاتی صورت ہے، جبکہ اسلام کا نظامِ حکومت ان سے اس بنیاد پر مختلف ہے کہ یہ ڈھانچے سے زیادہ اصولوں کی بات کرتا ہے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ان میں کئی اقداریں مشترک بھی ہیں، جیسے قانون کی حکمرانی، حکمران کی جواب دہی، عوامی مشاورت اور اقلیتوں کے حقوق، جن کی وجہ سے جدید مسلم ریاستوں نے آئین و انتخابات جیسے جدید طریقے اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ سمجھ کر اختیار کیے ہیں۔ اختلاف اصلاً حاکمیت کے ماخذ، قانون سازی کی حدود اور حکمران کے انتخاب کی مخصوص صورتوں پر رہتا ہے، جس پر علماء و آئینی ماہرین میں علمی بحث موجود ہے اور طالب علم کو یہ بحث احترام کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جمہوریت عوامی نمائندگی و آزادی کا نظام ہے، صدارتی نظام منتخب صدر کی قیادت میں مستحکم و متوازن انتظامی ڈھانچہ ہے اور اسلامی نظامِ حکومت حاکمیتِ الٰہی، شوریٰ، عدل اور احتساب پر مبنی اصولی نظام ہے۔ تینوں کا مقصد اگر انصاف اور فلاح ہو تو حکمرانی انسانیت کی خدمت بن جاتی ہے، اور اگر مقصد صرف اقتدار ہو تو ہر نظام اپنی روح کھو دیتا ہے۔ سیرتِ طیبہ اس آخری نکتے کی سب سے بڑی گواہ ہے کہ نظام کی اصل قدر اس کے کاغذی ڈھانچے میں نہیں بلکہ اس کے چلانے والوں کے عدل اور خدا خوفی میں ہوتی ہے۔